جناب ڈاکٹر سعید اللہ قاضی پشاور یونیورسٹی

اسلامی ذہن کیسے پیدا ہو؟

انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو سلیم فطرت لے کر آتا ہے۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا رہتا ہے، مختلف عناصر اس کی اس فطرت پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں، ان میں سے ایک اہم عنصر اس کے قریب ترین دوست والدین ہیں جو اس کی اس فطرت کو اعتدال و تناسب کی حدود سے نکال کر بے اعتدالی کے راستے پر لگا لیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہ کبھی خود مختاری کا رویہ اختیار کر کے بے اعتدالی کا مرتکب ہوتا ہے اور کبھی بندگی غیر کا طوق اپنے گلے میں ڈال کر اپنی فطرت کے خلاف بغاوت کرنے پر اتر آتا ہے۔ اس مضمون کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں واضح فرمایا ہے۔ صحیحین میں ہے کہ ہر بچہ انسانی فطرت لے کر آتا ہے۔ یہ ماں باپ ہیں جو بعد میں اسے یا تو یہودی بناتے ہیں، یا عیسائی یا مجوسی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہر جانور صحیح وسالم پیدا ہوتا ہے۔ کوئی بچہ بھی کٹے ہوئے کان لے کر نہیں آتا۔ بعد میں مشرکین اپنے اوہام جاہلیت کی بنا پر اس کے کان کاٹتے ہیں۔

مسند احمد بن حنبل میں اور سنن نسائی میں ایک روایت ہے کہ ایک جنگ میں مسلمانوں نے دشمنوں کے بچوں تک کو قتل کر ڈالا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو سخت ناراض ہوئے اور فرمایا لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ آج حد سے گزر گئے اور بچوں تک کو قتل کر ڈالا۔ ایک شخص نے عرض کیا، کیا یہ مشرکین کے بچے نہ تھے؟ فرمایا، تمہارے بہترین لوگ مشرکین ہی کی تو اولاد ہیں۔ پھر فرمایا، ہر متنفس فطرت پر پیدا ہوتا ہے یہاں تک کہ جب اس کی زبان کھلنے پر آتی ہے تو ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی بنا لیتے ہیں۔

بچوں کی زندگی میں والدین کا کردار:

یوں تو اللہ تعالیٰ اصل خالق ہیں۔ مخلوق کو پیدا تو خدا کرتا ہے لیکن اس کی پیدائش و پرورش کا ظاہری سبب والدین بنتے ہیں۔ اللہ ذوالجلال نے ہر جاندار کے جوڑے بنائے ہیں کہ ان کی نسل تباہ ہوتی رہے۔

انسان چونکہ اشرف المخلوقات ہے، اسی کے لیے زمین و آسمان کی تخلیق عمل میں لائی گئی ہے۔ اسی لیے انسانی نسل کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور جتنا مشکل اور صبر آزما کام انسان کے بچے کی پرورش ہے دنیا کے کسی اور جاندار بچے کی نہیں۔

جانور ایک خاص حد تک بچوں کی خوب دیکھ بھال کرتے ہیں اور بعض جانوروں میں بچوں کے لیے اتنی محبت پائی جاتی ہے کہ اگر کسی دوسرے نے ان کے بچوں کو چھیڑا تو وہ ڈسنے یا پھاڑ ڈالنے پر تل جائے۔

دراصل اسی جذبے کی بناء پر بچوں کی بہترین پرورش ہو سکتی ہے۔ تکمیل اور رتبے کے لحاظ سے چونکہ انسان تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ اکمل و اعلیٰ اور برتر و بالا ہے اس لیے انسانی بچہ کی پیدائش و پرورش بلکہ ساری زندگی میں اہتمام، محنت اور مشقت سب سے زیادہ رکھی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی نسل کی بقاء کے لیے خود خدا تعالیٰ نے والدین میں اپنے بچوں کے لیے ہمدردی اور محنت کا ایسا شدید فطری جذبہ پیدا کر دیا ہے کہ وہ بچہ کو اپنی جان سے عزیز رکھ کر پوری محنت اور الفت سے اس کی پرورش کرتے ہیں۔

پیدائش کے وقت کسی حیوان کا بچہ اتنا ضعیف اور محتاج نہیں ہوتا جتنا کہ انسان کا بچہ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے غور و پرداخت کی ضرورت کئی برس تک ہوتی ہے۔ یہ کام نہایت مشکل اور ہمت طلب ہے۔ اس مشکل مہم کی ذمہ داری صرف والدین اٹھا سکتے ہیں اور اس مہم کی کامیابی ایک منظم گھر ہی سے وابستہ ہو سکتی ہے۔

یہ والدین ہی ہیں جو اپنی اولاد کی پرورش میں دن کا چین اور رات کا سکون قربان کرتے اور اپنی زندگی کا پورا سرمایہ لگا دیتے ہیں۔ اس کے معمولی دکھ سے اپنی ساری خوشیاں بھول جاتے ہیں اور اس کی ذرا سی بیماری سے رات رات بھر بے چین اور بے خواب رہتے ہیں۔ اس کے ذرا سا رو اٹھنے پر والدین کی کائنات پر غم کے بادل چھا جاتے ہیں اور اگر بچہ مسکرا اٹھے تو اُن کی زندگی کی فضا خوشیوں اور مسکراہٹوں سے منور ہو جاتی ہے۔

گھر ایک مضبوط قلعہ ہے جس میں بچے جو قوم کے نونہال ہیں، بیرونی حوادث اور خطرات سے محفوظ ہو کر پروان چڑھتے ہیں۔ والدین اس قلعہ کے پاسبان اور نگران ہوتے ہیں، اور وہ بچے کی حفاظت اور نگہداشت بہت تندہی اور جانسپاری سے سرانجام دیتے ہیں۔

والدین جس خلوص اور محبت سے اولاد کی تربیت کرتے ہیں اور کر سکتے ہیں کسی اور شخص سے ایسی توقع نہیں کی جا سکتی۔ بچہ سب سے پہلے ہر بات گھر میں والدین سے سیکھتا ہے جیسے اخلاق و کردار والدین رکھتے ہیں ویسے ان کے بچے سیکھیں گے۔ بعض صفات تو بچہ کو ورثے میں ملتی ہیں لیکن زیادہ صفات بچہ دنیوی تربیت میں والدین سے سیکھتا ہے اور ماں باپ کو اولاد جان سے زیادہ عزیز ہوتی ہے اس لیے وہ بچوں کو شفقت و پیار سے پڑھا سکتے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ گھر ایک سلطنت سی ہے جس میں باپ صدر کی طرح ہوتا ہے ماں وزیرِ اعلیٰ کی حیثیت رکھتی ہے اور بچے رعایا کی۔ اس سلطنت میں عوام کا ہر باشندہ ذمہ دار ہے۔ اگر ہر شخص اپنی اپنی ذمہ داری صحیح طریقہ سے نبھائے تو نتیجتاً سلطنت، یہ گھر جنت کا نمونہ بن جائے۔ ایسے گھر میں جو بچے تعلیم و تربیت حاصل کریں وہ ملک و ملت کے لیے بہترین سرمایہ ثابت ہوتے ہیں۔ پھر یہ بھی قابلِ غور بات ہے کہ بچپن میں سیکھی ہوئی عادات خصائل آگے چل کر پختہ ہو جاتی ہیں۔ گھر کی زندگی بچوں کو دنیا کی وسیع تر زندگی کی ذمہ داریوں کے قابل بناتی ہے۔

جدید علمِ نفسیات کا کہنا ہے "جو کچھ سکھانا ہو چھوٹی عمر میں یعنی چھ سات سال تک بچوں کو سکھا لو کیونکہ بعد میں یہی شروع کی عادات پختہ ہو جاتی ہیں اور ساری عمر ساتھ چلتی ہیں۔ ماہرینِ علمِ نفسیات گو اس فلسفہ کا علم آج ہوا ہے لیکن قرآن و سنت نے آج سے چودہ سو سال قبل والدین پر بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ڈال دی تھی۔

اوّلین تربیت گاہ گھر ہے:

بچوں کی اولین تربیت گاہ "گھر" ہے بچپن میں کھانے، پینے، اٹھنے، بیٹھنے اور گفتگو کرنے کے جو انداز بچے سیکھتے ہیں ان کی بنیاد بہت پختہ ہوتی ہے۔ بچپن میں ان کے مزاج اور حرکات و سکنات پر جو رنگ چڑھ جاتا ہے وہ عمر بھر ساتھ دیتا ہے، اس کا بدلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر خاندان کی اپنی روایات ہوتی ہیں۔ اس کے افراد

زندگی کے کسی شعبہ میں ہوں، ان میں ان روایات کی جھلک ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ والدین اگر مسلمان ہیں تو وہ حتی الوسع اپنی طرف سے اپنے بچوں کی نیک تربیت کرتے ہیں۔ ان کے دلوں میں ایمان بٹھاتے ہیں۔ اسلام کی محبت پیدا کرتے ہیں۔ انہیں زندگی کے خوش نما آداب و اطوار سکھاتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وأمر اهلك بالصلوٰة واصطبر عليها"

"گھر والوں کو نماز پڑھنے کا حکم دے اور خود بھی اس پر پختہ رہ"۔

کسی قوم کے باقی رہنے کا راز اس بات میں ہے کہ اس کے افراد میں حسن عمل موجود ہو۔ حسن عمل اس وقت پیدا ہو سکتا ہے کہ تربیت عمدہ ہو، اچھی اور عمدہ تربیت تو مکتب اور مدرسہ میں ہی مل سکتی ہے لیکن گھریلو ماحول اگر اخلاق سے بیگانہ ہو تو استاد یا معلم کی ہزار کوششیں رنگ لانے میں کامیاب نہیں ہو سکتیں، عمدہ تربیت کی بنیاد گھر ہی میں رکھی جا سکتی ہے۔

دُنیا کا ہر انسان حسب توفیق اپنے بچوں کی پرورش کا فریضہ انجام دیتا ہے لیکن پرورش سے زیادہ ضرورت ان کی تعلیم و تربیت کی ہے۔ اسلام نے اس پر بہت زور دیا ہے۔ طبرانی وغیرہ میں ایک روایت ہے کہ ایک شخص نے سرکار دو جہاں ﷺ سے پوچھا، "حضور میں کس سے نیکی کروں؟ فرمایا اپنی اولاد سے نیکی کرو کیونکہ تمہارے ذمہ جس طرح والدین کے حق ہیں اسی طرح اولاد کے بھی حق ہیں"۔ ابن حبان نے حضور اکرم ﷺ کی یہ حدیث بیان کی ہے۔ آپ نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ اس باپ پر رحم کرے جو اپنی اولاد کی ایسی تربیت کرے کہ وہ اولاد اس کا حق پہچان سکے۔

بیہقی نے حضور اکرم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ اولاد کا ماں باپ پر یہ حق ہے کہ اُس کی اچھی تربیت کریں اور اس کا نام اچھا رکھیں۔

قرآن حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"يا ايها الذين امنوا قوا انفسكم واهليكم نارا"

"اے لوگو جو ایمان لاتے، بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے"۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ ہر شخص نہ صرف اپنے آپ کو عذاب الٰہی سے بچانے کا ذمہ دار ہے بلکہ اس کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ خدا نے جس خاندان کی پرورش کا بار اس پر ڈالا ہے اس کی بھی حتی الوسع ایسی تعلیم و تربیت کرے جس سے وہ خدا تعالیٰ کے پسندیدہ انسان بنیں۔ اگر وہ جہنم کے راستے کی طرف جا رہے ہوں تو جہاں تک اس کے اختیار میں ہو ان کو روکنے کی کوشش کرے۔

نہ صرف دنیا میں ان کی نیک پرورش کرے کہ اس کے بچے خوشحال ہوں بلکہ اس سے زیادہ ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ ان کو آخرت میں جہنم کا ایندھن نہ بننے دیں۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "تم میں سے ایک راعی ہے اور ہر ایک اپنی رعیت کے معاملہ میں جوابدہ ہے حکمران راعی ہے اور وہ اپنی رعیت کے معاملہ میں جوابدہ ہے۔ مرد اپنے گھر والوں کا راعی ہے اور وہ ان کے بارے میں جوابدہ ہے"

آں حضرتؐ کا حکم ہے کہ جب بچے سات سال کے ہو جائیں تو انہیں نماز کی تلقین کرو، اگر دس سال کے ہو کر بھی نماز نہ پڑھیں تو مار کر پڑھاؤ۔

ان ارشادات سے بچوں کی تربیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ماں باپ نہ صرف اولاد کی جسمانی پرورش کے ذمہ دار ہیں بلکہ اصل ذمہ دار روحانی اور اخلاقی تربیت کے ہیں حضورؐ اکرم کا ارشاد ہے کہ:

"کوئی باپ اپنے بچہ کو حسن ادب سے بہتر عطیہ نہیں دے سکتا"

پرورش کے فرائض:

اللہ تعالیٰ نے والدین میں اولاد کے لیے یہ جذبہ پیدا کیا ہے کہ وہ ان کی محبت اور شوق سے پرورش کریں لیکن بعض والدین حالات، ماحول یا زمانہ سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ بچوں کی صحیح تربیت و پرورش نہیں کرتے۔ ایسے والدین بہت ملتے ہیں جو بچوں کی صحیح پرورش کرنے کے بجائے انہیں پیدا ہوتے ہی نوکروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ایسے والدین میں نہ تو اولاد کے لیے محبت ہوتی ہے نہ وہ جذبہ جو دراصل اولاد کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے لیے چاہیے۔ پھر ایسی اولاد بھی تو اپنے دل میں والدین کے لیے محبت نہیں رکھتی، کیونکہ انہوں نے والدین کی محبت نہیں دیکھی ہوتی۔ آیاؤں کے رحم و کرم پر پلنے والے بچے کیوں کر اس جذبہ سے آگاہ ہوں گے؟ اس کے برعکس جو ماں باپ اپنے ہاتھوں سے بچوں کی خدمت

کرتے ہیں اور محنت و مشقت سے اس کی پرورش و تربیت کرتے ہیں۔ دنیا میں بھی ان کی یہ محبت رنگ لاتی ہے اور آخرت میں بھی ایسے ہی والدین کے لیے اللہ ذوالجلال والاکرام کے ہاں بلند درجے ہیں اور اولاد بھی ایسے ہی والدین کی نیک صالح اور خیر خواہ ہوتی ہے۔ جابر بن سمرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"انسان کا اپنی اولاد کو ادب کی ایک بات سکھانا ایک صاع غلہ خیرات کرنے سے بہتر ہے۔"

اس سلسلے میں زیادہ ذمہ داری ماں کی ہوتی ہے کیونکہ پہلی درسگاہ ماں کی گود ہوتی ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ ماں کو دین سے زیادہ واقفیت ہونی چاہیے۔ نہ صرف قرآن حکیم کو سمجھ کر پڑھنا چاہیے بلکہ اسے حدیث کا بھی کچھ نہ کچھ مطالعہ کرنا چاہیے۔ نہ صرف دین کی بنیادی باتوں اور ایمان کے تقاضوں سے آگاہ ہونا چاہیے بلکہ ذاتی زندگی، گھریلو زندگی، خاندان کی زندگی اور عام معاشرتی زندگی کے بارے میں دین کے احکام کا بھی علم ہونا چاہیے۔ دین کے احکامات سے ماں کی ناواقفیت اولاد کی صحیح تربیت میں رکاوٹ کا سبب بنتی ہے اور ان میں غیر شرعی طریقے رائج ہو جاتے ہیں۔

ماں جو علم دینی حاصل ہو اسے اپنی عملی زندگی، اخلاق و سیرت اور گھر کی زندگی میں برتنے کا لائے۔ اس سلسلہ میں اس کی توجہ کی مستحق سب سے زیادہ اس کی اولاد ہے جسے دین اور دینی اخلاق کی تربیت دینا اس کی ذمہ داری ہے۔ گویا کہ خدا تعالیٰ نے اس کے ہاتھ میں امتحان کے وہ پرچے دے دیے ہیں جن پر اگر وہ کامیابی کے نمبر نہ لے سکیں تو پھر دوسرا کوئی پرچہ بھی ان کے اس نقصان کی تلافی نہ کر سکے گا۔

اولاد کی پرورش میں والدین کو یہ نقطہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ان کے سامنے اسلام کا وہ مکمل نظام حیات تفصیل کے ساتھ پیش کریں جو اسلام کے اصولوں پر مبنی ہے اور پھر اس نظام حیات کو دنیا کے باقی زندگی کے نظاموں سے مقابلہ کرنے کے بعد یہ ثابت کر دیں کہ انفرادی و اجتماعی، اخلاقی و روحانی، سیاسی و معاشی، غرض تمام شعبوں میں بہترین رہنمائی کرتا ہے۔ . . . . . .

. . اور جس کے اختیار کرنے سے پورا انسانی معاشرہ نہ صرف بے چینی اور تکالیف سے چھٹکارا پا سکتا ہے بلکہ فلاح و سعادت کی انتہائی منزلوں تک پہنچ سکتا ہے۔ والدین کو

چاہیے کہ وُہ اولاد کو ذہن نشین کرائے کہ انسانی زندگی کے اردگرد جتنے مسائل اور جس قدر مشکلات پھیلی ہوئی ہیں ان کا صحیح اور قابل اعتماد حل صرف اسلام کے پاس ہے۔ دوسرے عطائی حکیموں کے جال میں پھنسنے کی بجائے اپنے نسخۂ کیمیا کا تجربہ کریں جو اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن اور اس کے رسولؐ کی سنت کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ بچے کی تربیت و تکمیل کے لیے جو چیزیں تربیت کے ساتھ اس کے اندر پرورش کی جانی چاہئیں وُہ اسلامی اخلاقیات ہیں۔ قرآن و حدیث کی رُو سے یہ اسلامی اخلاقیات چار مراتب پر مشتمل ہیں۔ ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان۔ ایمان اسلامی زندگی کی بنیاد ہے۔ یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ توحید اور رسالت کے اقرار کا نام ایمان ہے۔ بچوں کے ذہن میں یہ بات بٹھانی چاہیے کہ اگر ایک مکمل انسانی زندگی کی عمارت اٹھ سکتی ہے تو اسی توحید کا اقرار کر لینے پر جو انسان کی پُوری انفرادی اور اجتماعی زندگی پر محیط ہو۔ جس کے مطابق انسان اپنے آپ کو اور اپنی ہر چیز کو خدا کی ملکیت اور اس کی امانت سمجھے، اس کو اپنا اور تمام دنیا کا ایک ہی جائز مالک، معبود، مطاع اور صاحب امر و نہی مانے، اسی کو ہدایت کا سرچشمہ سمجھے۔ خدا کی اطاعت و فرمانبرداری سے انحراف یا اس کی ہدایت سے بے نیازی و لاپرواہی یا اس کی ذات، اس کی صفات، اس کے اختیارات میں کسی کو شریک کرنا، جس طریقے سے جس رنگ میں بھی ہو سراسر گمراہی ہے۔ پھر اس عمارت میں استحکام اس فیصلہ سے پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ فیصلہ کرے کہ وُہ اور اس کا سب کچھ اللہ تعالیٰ کا ہے اور اسی کے لیے ہے اللہ کی پسند و ناپسند کو اپنی پسند و ناپسند پر برتری دے۔

ایمان بنیادی حقیقت ہے:

اسی طرح بچے کو یہ بھی بتانا چاہیے کہ نبوت پر ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا۔ جب تک انسان زندگی کے سارے معاملات میں نبی کو اپنا رہنما نہ مان لے اور اس کی راہنمائی کے خلاف یا اس سے آزاد جتنی رہنمائیاں ہیں ان کو رد نہ کر دے۔

کتاب پر ایمان بھی اس وقت تک ناقص ہی رہتا ہے جب تک نفس میں کتاب اللہ کے بتائے ہوئے اصولِ زندگی کے سوا کسی دوسری چیز کے تسلط پر رضامندی کا شائبہ بھی باقی ہو۔ اسی طرح آخرت میں ایمان مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ جب تک نفس پوری طرح آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے اور اخروی قدروں کے مقابلے میں دنیوی قدروں کو ٹھکرا دینے

پر آمادہ نہ ہو جاتے۔

ایمان کی بنیادیں جب مکمل اور گہری ہو جاتی ہیں تو ان پر اسلام کی منزل شروع ہوتی ہے۔ اسلام دراصل ایمان کا عملی ظہور ہے۔ ان کا آپس میں تعلق بیج اور درخت جیسا ہے۔ بیج میں جو کچھ ہوتا ہے وہی درخت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایمان کا ظہور آدمی کی عملی زندگی میں اخلاق و عادات اور اطوار میں، برتاؤ اور تعلقات کے کٹنے جڑنے میں، قوتوں اور قابلیتوں اور اوقات کے مصرف میں غرض زندگی کے ہر ہر عمل میں ہو کر رہے گا۔ ان میں سے جس پہلو میں اسلام کی بجائے غیر اسلام ظاہر ہو رہا ہو۔ یقیناً اس پہلو میں ایمان موجود نہیں، یا ہے بھی تو بالکل بودا اور بے جان ہے اور اگر عملی زندگی ساری کی ساری غیر مسلمانہ شان سے بسر ہو رہی ہو تو دل ایمان سے خالی ہے یا زمین اتنی بنجر ہے کہ ایمان کا بیج برگ و بار نہیں لا رہا ہے۔

اس کے بعد بچے کے ذہن میں تقویٰ راسخ کرنا چاہیے جو حقیقت میں خدا ترسی اور احساسِ ذمہ داری ہی ہے۔ بچوں کو تقویٰ کا مفہوم یوں سمجھانا چاہیے کہ تقویٰ سے مراد دل میں خدا کا خوف پیدا ہو جانا، اس کی عبادت کرنا، عبد و معبود کا سمجھنا اور خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری اور جواب دہی کا احساس پیدا ہو جانا ہے کہ دنیا میں جب خدا نے انسان کو ایک مہلتِ عمر دی تو اس نے اپنی طاقت، قوت اور قابلیتوں کا استعمال کیسے کیا؟ آخرت میں مستقبل کا فیصلہ اسی چیز پر منحصر ہے۔

جب انسان میں یہ احساس یہ شعور پیدا ہو جائے تو اس کا ضمیر روشن ہو جاتا ہے۔ دین میں اس کی بصیرت تیز ہو جاتی ہے۔ اسے ہر وہ چیز ہر وہ کام کھٹکنے لگتا ہے جو خدا تعالیٰ کی رضا اور اس کی پسند کے خلاف ہو۔ ایسا شخص اپنی زندگی کا خود محاسبہ کرنے لگتا ہے کہ کہیں اس سے ایسا کام سرزد نہ ہو جائے جو حق کے خلاف ہو۔ ایسی کیفیت ایسا احساس انسان کی زندگی کے کسی ایک پہلو، کسی مخصوص دائرہ میں ظاہر نہیں ہوتا بلکہ انسان کے تمام کا تمام زندگی اور پورے طرزِ فکر میں ظاہر ہوتا ہے۔ تقویٰ کے بعد احسان کا درجہ آتا ہے جس سے ایک بہترین مسلمان اور وفادار شہری پیدا ہوتا ہے۔ یہ اسلام کی بلند ترین منزل ہے۔ احسان حقیقت میں خدا تعالیٰ اور اس کے رسولؐ اور اس کے دینِ اسلام سے گہری محبت ہے۔ ان سے قلبی لگاؤ ہے۔ یہ ایسی سچی وفاداری اور جاں نثاری ہے جو مسلمان کو اسلام میں گم کر دے

تقویٰ کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی ناراضگی سے بچنے پر ہے۔ احسان کی بنیاد محبت خدا اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے پر ہے۔

گھر دراصل ایسا کارخانہ ہے جس پر بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اگر یہاں سے بچہ بن سنور کر نکلے گا تو باہر کی دنیا میں قابل اعتماد اور سلجھا ہوا شخص مانا جائے گا۔ اگر گھر سے بگڑ کر نکلتا ہے تو باہر کی زندگی میں تو پہلے ہی بگاڑنے والے بہت سے عناصر موجود ہیں جن میں پڑ کر بچہ مزید بگڑے گا اور ایسے ہی بگڑے ہوئے افراد مذہب اور قوم و ملک کے دشمن ہوتے ہیں۔

بچوں کی پرورش کا کام نہایت محنت طلب ہے، وہ والدین کا ہر ہر عمل بغور دیکھتا ہے جس کے نتیجہ میں اگر وہ زبانی سمجھانے سے کچھ نہیں سمجھ سکا تو وہ صرف دیکھنے سے سیکھ لیتا ہے مثلاً جب والدین زبانی بچے کو کسی برائی سے روکنے کی ترغیب دیتے ہیں اور دوسرے ہی وقت اس کا ثبوت بن جاتے ہیں۔

جھوٹ سے گریز:

بچہ کو چوری سے منع کیا جاتا ہے لیکن وہ محلے سے کسی قیمتی چیز کی چوری کرتا ہے جس سے اس کے والدین بجائے ڈانٹ ڈپٹ کے خوش ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ اس خوشی کا اظہار براہ راست نہیں کیا جاتا لیکن نتیجتاً بچہ اس کو والدین کی خوشی اور رضامندی سمجھ لیتا ہے اور چوری کو اپنی عادت بنا لیتا ہے۔ ایسے ہی افراد قوم و ملک کے مجرم ہوتے ہیں۔

دوسری مثال یوں سمجھ لیں کہ جب بچہ کو والدین سچ بولنے کی تلقین کرتے ہیں، اور جھوٹ کی برائیاں بتا بتا کر بچنے کی ترغیب دیتے ہیں لیکن یہی والدین جب کسی کام میں اپنی بھلائی اپنا فائدہ دیکھتے ہیں تو اس مقام پر آکر وہ سچائی کا دامن چھوڑ دیتے ہیں اور یہ کم وقتی فائدہ اٹھانے اور نقصان سے بچنے کے لیے ہزار جھوٹوں سے کام لیتے ہیں۔ اس عمر میں چونکہ بچہ والدین کی حرکات و سکنات کو غور سے دیکھتا ہے، اس لیے وہی کرتا ہے جو والدین کرتے ہیں۔ بچے نقال ہوتے ہیں، وہ بولتے ہیں جو بڑے بولیں اور جھوٹ بول بول کر عادت بنا لیتے ہیں۔ یہ عادت ان کی اپنی زندگی کا لازمی جزو بن جاتی ہے۔ بڑے ہو کر ایسے ہی بچے قوم کے مجرم، ملک کے ڈاکو بنتے ہیں اور بڑے بڑے جرائم کے مرتکب ہو کر اپنی ذات کو بھی نقصان پہنچاتے اور ملک و ملت کو بھی ایذا پہنچاتے ہیں۔ اس کے علاوہ آخرت کے سزا کے بھی مستحق ہوتے ہیں۔

والدین کو ان تمام باتوں کو مدِ نظر رکھ کر اپنے بچوں کی پرورش کرنی چاہیے۔

ماحول کا اثر:

دوسری اہم چیز جو بچے کے ذہن پر اثر انداز ہوتی ہے "ماحول" ہے۔ ماحول انسان کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ جب کسی یہودی، نصرانی یا آتش پرست و بت پرست کا بچہ ہوتا ہے تو ایک سچے مسلم کی حیثیت سے پیدا ہوتا ہے۔ پھر جوں جوں وہ عقل و شعور کی منزلیں طے کرتا جاتا ہے اس کا ماحول اس پر غالب آتا جاتا ہے اور پھر اسے اپنے سانچے میں ڈھال لیتا ہے اور وہ بچہ اس مذہب کو اختیار کر لیتا ہے جس کے پیروکار اس کے والدین اس کے اردگرد کے لوگ ہوتے ہیں۔

غرض یہ کہ ماحول کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے۔ اگر ماحول اچھا ہے تو اچھے اثرات ظاہر ہوں گے۔ اگر برا ماحول ہے تو برے اثرات نمایاں ہوں گے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "نیک ساتھی کی مثال کستوری بیچنے والے کی سی ہے اور بد ساتھی کی مثال بھٹی دھونکنے والے کی سی ہے۔ پس کستوری اٹھانے والا یا تو تجھے کستوری دے دے گا یا تو اُسے اس سے خرید لے گا۔ (اگر دونوں باتیں نہ ہوں گی تو کم از کم تو کستوری کی خوشبو ہی کو حاصل کرے گا اور بھٹی دھونکنے والا یا تو کپڑے جلا دے گا (اور اگر یہ نہ ہو گا تو کم از کم) تو اس کو بدبو تو ضرور ہی محسوس کرے گا۔

نیک صحبت کے لازمی اچھے اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی بہتر مثال شاید ہی کہیں کسی نے بیان کی ہو۔ کستوری کی خوشبو خود بخود ارد گرد پھیلتی ہے۔ اور لوگوں کو معطر کرتی ہے۔ چاہے لوگ اس کو سونگھنے کا ارادہ رکھتے ہوں یا نہیں، اسی طرح نیک لوگوں اور اچھے ماحول کا بھی اچھا اثر پڑتا ہے۔ چاہے لوگ ماحول کا اثر قبول کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں یا نہیں۔

اچھوں کی صحبت میں بیٹھنے سے انسان کے دل میں غیر ارادی طور پر اچھائی کے ساتھ محبت پیدا ہوتی ہے اور دل میں بڑی قوت محسوس کرنے لگتا ہے۔ اگر دوست، احباب، عزیز و اقارب اور ملنے ملانے والوں کا حلقہ نیکو کار لوگوں پر مبنی ہے تو انسان ان نیک خیال اور نیک عمل لوگوں کے زیرِ سایہ رہ کر اچھے اثرات قبول کرتا ہے اور ان خرابیوں سے بہت حد تک محفوظ رہتا ہے جو برائیاں، جو خرابیاں عالمگیر ہوتی ہیں۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کا فرمان ہے "بروں کی ہم نشینی سے تنہائی بہتر ہے اور تنہائی

سے نیک لوگوں کی صحبت بدرجہا بہتر ہے۔"

ایک دن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا،

"بظاہر ان چاروں چیزوں میں ایک ایک خوبی ہے مگر حقیقت میں یہ چاروں چیزیں چار ضروری امر ہیں۔"

پھر آپؓ نے چاروں چیزوں کا ذکر فرمایا تو سب سے پہلے جس شے کا ذکر کیا وہ یہ تھی کہ "نیکوں سے ملنا ایک خوبی ہے کیونکہ اس کے بعد ان کی پیروی کرنا ضروری ہو جاتا ہے"

بقیہ تین چیزیں جو آپؓ نے بیان فرمائیں وہ تلاوت قرآن پاک، بیمار پرسی اور قبروں پر جانا تھا۔

نیک صحبت کا یہی فائدہ بہت بڑا ہے کہ زندگی میں ایسے ہمدرد اور فرض شناس ساتھی مل جاتے ہیں جو دنیوی زندگی کے دکھ سکھ میں شریک بھی ہوتے ہیں اور اپنے محبت آمیز سلوک سے دکھوں کے احساس کو بھی کم کرتے ہیں۔

معین الدین چشتیؒ کا ارشاد ہے:

"نیکوں کی صحبت نیک کام سے بہتر اور بروں کی صحبت برے کام سے بدتر ہے"

آپ نے نیکوں کی صحبت کو نیک کام سے بہتر اس لیے کہا کہ نیک صحبت کی وجہ سے جب انسان کو نیکی سے محبت ہو جاتی ہے تو پھر اس کی نیکیوں کی تعداد بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔

اسی طرح برے کام کی نسبت بری صحبت کا بدتر ہونا ایسا ہے کہ برا کام کر کے تو شاید انسان کو ندامت ہی ہو اور توبہ کر کے اپنا گناہ بخشوا لے، مگر بری صحبت تو دل کو ایسے زنگ آلود کر دیتی ہے کہ انسان کے دل سے برائی کو برا سمجھنے کا احساس ہی مٹ جاتا ہے جس ماحول میں لوگوں کو نیکی سے محبت ہو اور اپنی اصلاح کا خیال رہے وہاں ان لوگوں سے زیادہ قوی ایمان والے تو فائدہ دیتے ہی ہیں، ان سے کمزور ایمان والے بھی بہت فائدہ پہنچاتے ہیں وہ ایسے کہ کبھی اپنے سے زیادہ مضبوط ایمان والے لوگ ہماری ہمت بندھاتے ہیں اور کبھی ہم اپنے سے کمزور ایمان والوں کی ہمت بندھاتے ہیں اور جس لمحے ہم کسی کی ہمت بندھا رہے ہوتے ہیں اس وقت ہماری ہمت خود بخود ہی بندھ جاتی ہے۔

یہ انسان کی فطرت ہے کہ جب کوئی بری بات پہلی دفعہ سامنے آتے تو دل میں اس

کے لیے بہت نفرت پیدا ہوتی ہے مگر جب دوسری بار دیکھی جائے تو نفرت کچھ کم ہو جاتی ہے۔ پھر تیسری دفعہ دیکھنے سے وُہ اور زیادہ کم ہو جاتی ہے۔ بار بار بُرائی کا سامنا کر کے نفرت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ پھر انسان اس بُرائی کے معاملے میں بے حس سا ہو جاتا ہے۔ اس کام کو اس برائی کو بُرا سمجھتا ہی نہیں۔ معاملہ صرف یہاں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ جب کسی چیز سے نفرت ختم ہوتی ہے تو پھر اس چیز میں کچھ دلچسپی پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے اور جب کوئی چیز زندگی میں بار بار دیکھنے میں آتے، بار بار ٹکرائے تو پھر وُہ دلچسپی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ انسان عملی طور پر اس برائی کو اختیار کر لیتا ہے گویا کہ اس بُرائی کو وُہ بُرا محسوس ہی نہیں کرتا بلکہ اس میں ملوث ہو جاتا ہے۔

صحیح تعلیم گاہ:

تیسری اہم چیز جو ذہن کو سنوارنے اور بگاڑنے میں معاون ثابت ہوتی ہے وُہ مکتب ہے۔

مکتب بچے کی دوسری درس گاہ ہے۔ یہ وُہ ٹھکانہ ہے جہاں بچہ علم کی دولت حاصل کرتا ہے۔ اس دولت سے سرشار ایک عالم اور ایک جاہل میں زمین و آسمان کا فرق ہے، علم کا حصول اسلام میں واجب ہے۔ قرآن حکیم کی ابتداء ہی ایک ایسے لفظ اور ایسی آیات سے ہوئی جس میں پڑھنے، لکھنے، علم و تعلیم کی ترغیب دی گئی کہ "اقرأ" "پڑھ"

تعلیم از حد ضروری ہے اور یہ معاشرے کے ہر ہر فرد کی زندگی کو ایسے بنیادی اصول و ضوابط کی روشنی سے منور کر دیتی ہے جو حقیقی ترقی کے لیے مشعل راہ بنے۔ بامقصد تعلیم نہ صرف ہر فرد کو معاشرے میں شخصی، شہری اور کارکن کی حیثیت سے تہذیب عمومی سکھاتی ہے بلکہ زندگی میں بننے سنورنے کے لیے وقت کا صحیح مصرف بھی بتاتی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تعلیم کے فرض ہونے کے بارے میں فرمایا ہے:

"طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ"

"روزمرہ زندگی سے متعلق بنیادی اسلامی تعلیمات کا حصول ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے"

سارا نظام عالم علم پر قائم ہے۔ دنیا کی ساری معاشی، معاشرتی اور سیاسی فتوحات صرف علم کے بل پر ہیں۔ اس کے بغیر کسی شخص اور کسی قوم کی دنیا اور آخرت میں ترقی اور سربلندی

ممکن نہیں۔

اسلامی معاشرے میں حاصل کی جانے والی تعلیم کا مقصد اسلامی شعور پیدا کرنا ہے۔ نہ صرف لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھانا ہوگا بلکہ ان پر زندگی کا مقصد اور صحیح طرزِ عمل واضح کرنا ہوگا یعنی مسلمان دینی تعلیم تو فرض سمجھ کر حاصل کریں تاکہ وہ عملی زندگی میں ایک عمدہ اخلاق کا نمونہ بن جائیں۔ اور کوئی مسلمان اگر اپنی پسند کے مطابق اور ذہنی میلان کے مطابق کوئی دوسرا علم سیکھے تو اس میں کمال تک اس لیے پہنچنے کی کوشش کرے کہ علم کے ذریعے انسانیت کی عزت اور انسانوں کی خدمت کرنا اس کا فرض ہے۔

قارئین
جانتے ہیں کہ

محکمہ ڈاک نے رجسٹری فیس کی شرح میں اضافہ کرکے تین روپے مقرر کردی ہے۔ لہٰذا اب ترجمان الحدیث بذریعہ وی۔ پی۔ پی طلب کرنے کے لیے آپ کو ۲۳ روپے ادا کرنا ہوں گے۔ جب کہ سالانہ چندہ وہی بیس روپے ہے۔ زائد خرچ سے بچنے کے لیے زرِ سالانہ بذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں!

والسلام

مینجر